فورٹ ولیم کالج کی غیر معروف داستانیں

ثمینہ سیف
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین، سمن آباد، لاہور

THE UNKNOWN TALES PRODUCED
AT FORT WILLIAM COLLEGE

Samina Saif, PhD
Assistant Professor of Urdu
Govt Post Graduate College (W) Samanabad, Lahore

Abstract

Urdu fictional literature flourished through a clear and organized plan in Fort William College. This college produced an unprecedented literature whose exploratory and critical treasure stands at the highest level in Urdu literature. On the other hand, there are some tales which have been neglected for certain reasons. These tales are complaining of their diminutiveness and insignificance in Urdu literature to the literary scholars and critics. In this article, the literary and technical aspects of the overshadowed fictional literature produced at Fort William College have been analyzed with the exploratory and critical approach.

Keywords:

فورٹ ولیم کالج، غیر معروف داستانی ادب، تحقیقی وتنقیدی سرمایہ، تخیل، عقائد، طرزِ زیست، مطالعاتی جائزہ

داستان سے قبل اُردو کا وجود بے معنی تھا، داستانی ادب نے اُردو کو ثروت مند بنایا۔ داستان شاہی اور عوامی حلقوں میں یکساں مقبول صنف تھی۔ بدلتے وقت کے تقاضوں کے تحت ناول اور داستان کی معرکہ آرائی کے نتیجے میں داستان کی پسپائی ہوئی مگر اِس کے باوجود آج بھی داستانیں اپنی جاذبیت اور ادبیت کے باعث اہلِ ادب کے ذوق کی طمانیت کا باعث ہیں۔ جس طرح اُردو ادب کو داستانی ادب نے سہارا دیا ویسے ہی انیسویں صدی کا داستانی ادب فورٹ ولیم کالج کے منت زیر بار ہے۔ اُردو نثر اور داستانی ادب کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز اسی کالج کا مرہون منت ہے۔ اِس دور کے داستانی ادب میں اسلوب کی روانی، سادہ بیانی اور آسان فہمی سر سید کے اصلاحی و ادبی مقاصد کا محرک بنی جسے محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور الطاف حسین حالؔی جیسے علما نے فروغ دیا۔ کالج میں 'باغ و بہار'، 'آرائش محفل'، 'سنگھاسن بتیسی'، 'بیتال پچیسی' اور 'مذہبِ عشق' جیسی لازوال اور معروف داستانوں نے اُردو نثر کو خاطر خواہ خود اعتمادی اور تقویت بخشی۔ درحقیقت یہ داستانیں اپنے اندر انیسویں صدی کے اُردو ادب کے امکانات و تجربات سموئے ہوئے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے معروف داستانی ادب پر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر گیان چند جین، سید وقار عظیم، ڈاکٹر آرزو چودھری، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، جیلانی کامران اور ڈاکٹر وحید قریشی کے تنقیدی خیالات رنگا رنگی اور علمی و مفید معلومات پر مبنی ہیں۔ درج بالا جید نقاد فورٹ ولیم کالج کے داستانی ادب کی ادبی خوبیوں پر فریفتہ ہیں۔ ان نقادوں کی ژرف بین نگاہوں نے کالج کے معروف داستانی ادب میں تخیل کو نہ صرف سرحدوں، مذاہب اور پیشیوں سے بالاتر ہو کر بلکہ جغرافیائی اور زمانی قیود سے آزاد ہو کر وسیع اور بلند تناظر میں دیکھا ہے۔ یہاں کالج میں لکھی گئیں غیر معروف منظوم و منثور داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ کرنے کا مقصد ان کے ادبی مقام کا تعین کرنا ہے، غیر معروف داستانی ادب کے تجزیے میں زمانی ترتیب کے بجائے ان کی مقبولیت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

گلزارِ چین: محمد خلیل علی خاں اشک کی داستان ''گلزارِ چین'' (۱۸۰۴-۱۸۰۵ء/ ۱۲۱۹ھ) کو داستانی ادب میں 'نگار خانۂ چین' یعنی 'قصۂ رضوان شاہ' (۱) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ نو ابواب پر مشتمل یہ عشقیہ داستان رضوان شاہ اور پری روح افزا کے عشق کے قصے سے مزین ہے۔ چین کے بادشاہ کے ہاں دعاؤں سے شہزادہ رضوان شاہ کا جنم ہوتا ہے۔ جوان ہونے پر شہزادہ اور پری روح افزا ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وزیرزادی میمونہ بھی شہزادے سے عشق کرتی ہے اور ان دونوں کو جدا کرنے کے جتن کرتی ہے لیکن بالآخر دونوں معشوق مل جاتے ہیں۔ 'گلزارِ چین' کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۶۶ء میں مرتب کیا۔ داستان کے مقدمے میں مرتب کا تحقیقی کام بہت اہمیت کا حامل ہے، وہ نسخے اور ماخذ کی تلاش کے علاوہ مصنف کی ذات کا سراغ لگانے کی سعی کرتے ہیں جبکہ تنقیدی حوالے سے انھوں نے صرف چند سطریں ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی اس داستان کو مرصع، پُر کار اور رنگین بیان تصور کرتے ہیں مگر اس مرصع کاری، پُر کاری اور رنگین بیانی سے طرز بیان میں سادگی اور روانی کا حسن متاثر نہیں ہوتا۔ ان کے خیال میں طرزِ نگارش میں رنگینی و پرکاری اور سادگی و روانی کے 'حسین اور متوازن امتزاج نے اس داستان کو فنی اعتبار سے ایک شاہکار بنا دیا ہے۔' (۲) جبکہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے سادہ نگاری کی بنا پر اس نثر کو جاندار کہا مگر انھیں یہ نثر فارسیت کے غلبے اور مرصع و مسجع ہونے کی بنا پر غیر فطری لگی جس نے ''بیانات کی روح، ان کی دلکشی اور تاثیر کو غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ جزئیات نگاری ہو کہ سراپا نگاری، گفتگو ہو کہ فضا و ماحول، طلسمات کا بیان ہو کہ رزم و بزم کا منظر، اشکؔ فارسی کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکے۔'' (۳) ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اگر اشکؔ کے پیرایۂ گفتار کو متوازن و معتدل کہا تو اس کے برعکس ڈاکٹر عبیدہ بیگم کو اشکؔ کے بیانات فارسی تراکیب و تشبیہات کی کثرت سے مستعمل لگے۔ اسلوب کے حوالے سے ان دونوں ناقدین کی تنقیدی آرا میں تضاد اور اختلاف موجود ہے۔ قصے پر کی گئی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے مطابق 'قصہ رضوان شاہ' داستانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اس میں حسن و عشق، فوق الفطرت عناصر، سحر و عیاری اور معرکہ آرائی و مہم جوئی کے واقعات موجود ہیں اور یہی داستانوں کی خاص صفات بھی ہیں۔ انھوں نے داستان کے پلاٹ کو بھی مرتب اور مربوط قرار دیا جس میں واقعات و بیانات داستانی رنگ و روغن سے آراستہ ہیں۔ وہ پلاٹ کو اشکؔ کے قلم کا کارنامہ تصور کرتی ہیں، ان کے مطابق اس پلاٹ میں:

> ''مختصر سی داستان میں طویل داستانوں کے سارے عناصر یکجا کر کے رکھ دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قصہ رضوان شاہ میں قصے اور داستان دونوں کا حسن موجود ہے۔'' (۴)

داستان کے پلاٹ کو ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات کی روشنی میں ہم داستان کی درج ذیل خصوصیات بیان کر سکتے ہیں۔ (۵) اولاً: یہ قصہ دلچسپ ہے اور مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی بھی اس کی دلچسپی کو گہنا نہیں سکی، ثانیاً: قصے میں انسانی رنگ و آہنگ کی نمائندگی کا خوبصورت پہلو بھی موجود ہے۔ ثالثاً: پلاٹ کی نظم و ترتیب میں وہ انفرادی شان ہے جو فنی اعتبار سے ایک اعلیٰ درجے کی کہانی کے پلاٹ میں ہونی چاہیے۔ پلاٹ میں جہاں محیر العقول اور انسانی واقعات قدم بہ قدم رونما ہوتے ہیں وہاں ان میں خاص انتظام و انصرام کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ پلاٹ کے بعد کردار نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مقدمے میں داستانی کرداروں کو اپنے فضا و ماحول سے ہم آہنگ پایا ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے وہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ کرداروں میں بھی بڑی زندگی اور جولانی موجود ہے۔

روح افزا داستان کی ہیروئن ہے۔شہزادہ، روح افزا پراُس وقت عاشق ہوتا ہے جب وہ ہرنی کے روپ میں ہوتی ہے۔کردار میں اس تبدیلی قالب پر شہناز کوثر تبصرہ کرتی ہیں کہ ''روح افزا (پری) کا مختلف روپ بدلنا اس چیز کی علامت ہے کہ حسن ظاہری اور حسن سیرت کسی ایک قالب کے پابند نہیں...... جب وہ ہرنی کے روپ میں ہے اُس کا اصل روپ نظروں سے مستور ہے۔'' (۶) جبکہ مجموعی طور پر سبھی کرداروں کے حوالے سے ڈاکٹر عبیدہ بیگم یہ رائے دیتی ہیں کہ ''اس داستان کے کرداروں میں کوئی نیا پن نہیں۔ یہ اپنے فعل وعمل میں داستانوں کے روایتی کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔'' (۷) ان کی رائے میں داستان کی کردار نگاری ذہن پر کوئی جاندار اور دیرپا نقش ثبت نہیں کرتی ہے۔ داستان میں طلسمانہ کے حوالے سے سلیم سہیل اشکؔ کے قلم کی ہنرمندی کو اُجاگر کرتے ہیں۔شہزادہ رضوان شاہ، پری روح افزا اور میمونہ کی تکون دیکھتے ہوئے ان کے ذہن میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' کا خیال آتا ہے نیز انھیں میمونہ اور ''انارکلی'' کی دلآرام کا کردار عشقیہ محاذ آرائیوں کی بدولت مماثل لگا۔اِن کے خیال میں تخیل کے کرشمے جو مولف کے ذہن کی پیداوار ہیں، ان سے داستان کے طربیہ قصے کی روانی، ربط اور تسلسل متاثر نہیں ہوتا ہے مزید برآں ''قصے کے آخری حصے میں طلسمانہ کمال متانت اور پورے ماورائی سیاق وسباق کے ساتھ نظر آتا ہے۔طلسمانہ کو اگر نکال دیا جائے تو قصے کی اہمیت ایک سپاٹ بیانیے کے علاوہ کچھ اور نہیں۔'' (۸)

اس داستان پر ناقدین بہت کم تنقیدی خیالات ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ ڈاکٹر آرزو چودھری (داستان کی داستان) اور ڈاکٹر سہیل بخاری (اُردو داستان: تحقیقی وتنقیدی جائزہ) کی کتب میں اس داستان کا حوالہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ناقدین کی بے توجہی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اشکؔ کی ''داستانِ امیرحمزہ'' کے سامنے ''گلزارچین'' کا رنگ پھیکا لگتا ہے۔اِس داستان کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چندجین نے بھی صرف تحقیقی امور کو مقدم جانا ہے۔داستان کو مرتب کرتے وقت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی تنقیدی حوالے کم فراہم کیے ہیں، ان کے مختصر تنقیدی بیانات کی روشنی میں داستان کا اسلوب، کردار نگاری اور قصہ گوئی داستانی معیار پر پورا اترتے ہیں۔داستان پر چند تنقیدی خیالات کا اظہار ڈاکٹر عبیدہ بیگم کرتی ہیں، وہ داستانی طرز بیان اور کردار نگاری کو کمزور جبکہ قصہ پن کو جاندار تصور کرتی ہیں۔طلسمانہ کے حوالے سلیم سہیل کو 'گلزارِچین' ثروت مند نظر آئی۔

چار گلشن: بینی نرائن جہاںؔ نے 'چار گلشن' (۱۸۱۱ء-۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ) میں شاہ کیواں اور شہزادی فرخندہ سیر کا قصہ بیان کیا ہے، اس داستان کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کیا ہے۔اس داستان کے معروف نہ ہونے کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بتائی ہے کہ اوّل تو یہ داستان اشاعت کے عمل سے نہیں گزر سکی، دوم: بینی نرائن جہاں نے

جب کالج میں ملازمت اختیار کی اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے عروج کا آفتاب ماند پڑ گیا تھا، ڈاکٹر گلکر سٹ بھی کالج سے کنارہ کش ہو چکے تھے یوں ادبی کتب کی پذیرائی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ انھی تمام وجوہات کی بنا پر بنی نرائن جہاںؔ کو وہ مقام و مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ حق دار تھے اور نہ ہی اس داستان کو وہ پذیرائی ملی جس کی یہ مستحق تھی۔ داستان کے مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی کا سارا مقدمہ تحقیقی نوعیت کا ہے جو مصنف کی ذات، تعلیم، آباو اجداد اور داستان کے ماخذ کے گرد گھومتا ہے، تنقیدی حوالے اس میں مفقود ہیں۔ مقدمے کے آخر میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بنی نرائن جہاںؔ کو اچھا نثر نگار کہا اور ''چار گلشن'' کی بدولت جہاںؔ کے نام کا ستارہ چمکتا رہنے کی بات کی ہے، جبکہ مذکورہ داستان کو مصنف کی دیگر تالیفات میں بہترین قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''ان کی یہ کتاب کہانی اور اسلوب دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔'' (۹) ڈاکٹر عبادت بریلوی نے داستان کی کہانی اور اسلوب کو کن وجوہات کی بنا پر اہم قرار دیا ہے اس کی وضاحت سرے سے مقدمے میں مذکور ہی نہیں، دوسرا وہ مصنف کی داستان کو دیگر تالیفات میں نمایاں مقام تو دیتے ہیں مگر اس کا جواز فراہم نہیں کرتے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ مقدمہ تنقیدی اعتبار سے مکمل معلومات بہم نہیں پہنچاتا ہے۔

داستان پر مفصل اور جامع تنقید ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی ہے۔ وہ ''چار گلشن'' کے حوالے سے داستان کا قصہ خوبصورت پیرائے میں بیان کرنے کے بعد پلاٹ پر تنقید کرتے ہوئے واقعات کو اصل قصے سے ہم آہنگ پاتی ہیں اور پلاٹ کی بنت سے مطمئن نظر آتی ہیں۔ کردار نگاری کے حوالے سے انھیں فرخندہ سیر کا کردار جاندار اور نمایاں لگا۔ انھوں نے اسلوب کو آساں اور رواں جانا کیونکہ اس میں ثقیل الفاظ مستعمل نہیں ہوئے ہیں، سیدھے سادے لہجے نے قصے کی دلچسپی کو چار چاند لگا دیے ہیں اور ''زبان اس قدر رواں اور نکھری ستھری ہے کہ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔'' (۱۰) یوں یہ داستان کالج کے مروجہ اصولوں کے مطابق سادہ، عام فہم اور محاورے کی پابند ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم ''چار گلشن'' کے اسلوب کو سراہتی ہیں جبکہ دیگر داستانی لوازمات کی داستان میں کمی کو اپنی تنقید میں بیان کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر وہ یہ تنقیدی موقف اختیار کرتی ہیں کہ ''چار گلشن کے قصے میں طوالت اور پیچیدگی بھی نہیں ملتی۔ یہ تو سیدھا سادا قدرے مختصر سا قصہ ہے جو بغیر ذہن و دماغ کو تھکائے چند خوشگوار تاثرات دے کر ختم ہو جاتا ہے۔'' (۱۱) جبکہ شہناز انجم کے نزدیک زبان و بیان کے حوالے سے یہ داستان نہ زیادہ جاندار ہے اور ''نہ ہی بالکل بے کیف و بدمزہ ہے بس درمیانی درجے کی نثر اس میں پائی جاتی ہے۔'' (۱۲) ان کے خیال میں مذکورہ داستان میں جزئیات نگاری اور سراپا نگاری کے اعلیٰ نمونے موجود نہیں ہیں، علاوہ ازیں تصویر کشی کرنے میں بھی مصنف کمال نہیں رکھتا۔

کسی بھی ادبی فن پارے کے اثر انگیز ہونے سے یہ مراد لیا جاسکتا ہے کہ اس میں فنی و ادبی خوبیاں موجود ہیں۔ ''بنگال کا اُردو ادب'' کے مصنف جاوید نہال بھی داستان کی اثر انگیزی اور تحیر خیزی کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''چار گلشن میں بھی اس عہد کی دوسری عشقیہ داستانوں کی طرح عجیب و غریب کردار، طلسمی فضا، مشکوک ماحول اور مافوق الفطرت خصوصیات اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔'' (۱۳) درج بالا تنقیدی آرا کی مدد سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنی نرائن جہاںؔ کی یہ داستان اگر زمانے کی ستم ظریفی کا شکار نہ ہوتی تو ان کا نام میر امنؔ کے بعد حیدریؔ اور دوسرے اعلیٰ پائے کے مصنفین میں ہوتا۔ بنی نرائن جہاںؔ نے 'چار گلشن' کے علاوہ 'بہارِ عشق'، 'گلزارِ حسن'، 'گل وصنوبر' اور 'باغِ عشق' کے نام سے داستانیں لکھی ہیں اوّل الذکر دونوں داستانوں پر تنقیدی مواد تو دور کی بات ان کا قلمی نسخہ ہی دستیاب نہیں ہے۔

گل وصنوبر: 'گل وصنوبر' کے نام سے دو داستانیں باسط خاں باسطؔ (۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۸ھ) اور بنی نرائن جہاںؔ (۱۸۲۴ء/ ۱۲۴۰ھ) دونوں نے اپنے اپنے انداز میں فورٹ ولیم کالج میں لکھی ہیں۔ باسط خاں کی یہ داستان ان کے مجموعے 'گلشن ہند' کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند 'اُردو کی نثری داستانیں' میں اس داستان کی زبان کو فورٹ ولیم کالج کی دوسری داستانوں مثلاً 'نثر بے نظیر' کی مانند پھیکا اور سپاٹ نہیں سمجھتے جبکہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم لکھتی ہیں کہ ''تمام واقعات میں ایک ربط اور تسلسل ہے۔ قصے کی زبان سریع الفہم، آساں اور رواں ہے۔'' (۱۴) ڈاکٹر شہناز انجم ''گل وصنوبر'' از باسط خاں کی نثر کو ''متانت، سادگی، صاف اور شگفتگی'' (۱۵) کا حامل قرار دیتی ہیں۔

'گل وصنوبر' کے نام سے دوسری داستان کو بنی نرائن جہاںؔ 'نو بہار' کے نام سے لکھتے ہیں۔ مصنف نے کرداروں کے نام بھی باسط خاں باسطؔ کی داستان کے کرداروں سے مختلف رکھے ہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا خیال ہے کہ ''بنی نرائن نے آراستگی سے بھی کام لیا اور جابجا سادہ و سلیس انداز بیان بھی اپنایا ہے۔'' (۱۶) علاوہ ازیں باسطؔ نے 'حسن ملوک' کے نام سے ایک اور غیر معروف طبع زاد قصہ بھی لکھا جسے اُردو داستانی ادب میں زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔

باغِ عشق: بنی نرائن جہاںؔ کی 'باغِ عشق' (۱۸۲۴ء/ ۱۲۴۰ھ) میں مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' کو نثری جامہ پہنایا گیا ہے۔ مولف داستان میں دلچسپی کی خاطر اشعار کا بھی اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے خیال میں ''کتاب کی زبان ادبی اور دلچسپ ہے۔'' (۱۷) ایم حبیب خاں نے 'باغِ عشق' میں کہانی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کرداروں میں محبت و عشق کا لازوال بندھن دیکھا جس کی مثال اُردو داستانی ادب میں ڈھونڈنا مشکل ہے۔ وہ جہاںؔ کی اس داستان کو کامیاب قرار دیتے ہوئے اسلوب کے حوالے سے یہ تنقیدی تاثر دیتے ہیں کہ ''بیان میں سادگی اور روانی ہے۔ اسلوب نگارش بھی جاندار ہے۔ بوجھل پن کہیں نظر نہیں آتا۔'' (۱۸)

حسن وعشق (گل وہرمز): محمد وارث شاہ نے فارسی مثنوی 'گلشن عشق' کو نثر میں ڈھالا جسے غلام حیدر عزتؔ نے گلکرسٹ کے حکم سے 'حسن وعشق' کے نام سے ۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۸ھ میں اُردو میں منتقل کیا۔ اس داستان کے پلاٹ، کردار نگاری اور طرز بیان پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے تنقید کی ہے، داستان میں جہاں عشق کی خاطر جنگ ہوتی ہے وہاں مہمات اور رزم آرائیوں کے باوجود انھیں پلاٹ مربوط اور کردار وفاداری کے حامل لگتے ہیں۔ اسلوب میں بعض خامیاں ہونے کے باوجود ان کا بیان ہے کہ ''اس قصے کے جذباتی بیانات بہت عمدہ ہیں۔ خال خال رنگین بیانی کے نمونے بھی ملتے ہیں مجموعی طور پر سادہ اسلوب رواں دواں ہے۔ اس لیے ایسے مقامات ناگوار نہیں گزرتے۔'' (۱۹) انھی خیالات کی داعی ڈاکٹر شہناز انجم ہیں وہ طربیہ انجام کے حامل اس قصے کو عشق کی مہمات، محیر العقول واقعات اور سحر انگیز ماحول کی بنا پر دلچسپ قرار دیتی ہیں۔ وہ اپنی تنقیدی بحث سمیٹتے ہوئے داستان کو سادگی اور رنگین بیانی کا آمیزش کہتی ہیں، ان کے مطابق ''حسن وعشق'' کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''نثر کا رجحان بتدریج سادگی کی طرف مائل ہے۔'' (۲۰)

بحرِ عشق (قصہ سیف الملوک): محمد عمر کی فارسی مثنوی (سیف الملوک) کو سید منصور علی نے 'بحرِ عشق' (۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۸ھ) کے نام سے نثری شکل میں قلم بند کیا۔ ڈاکٹر شہناز انجم اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم تنقید کرتے ہوئے داستان کے اسلوب میں فنی ناپختگی، ادبی چاشنی کا فقدان اور بیان میں شیرینی کی کمی جیسی کوتاہیوں کا ذکر کرتی ہیں مگر ساتھ ہی دونوں ناقدین ہمدردانہ تنقیدی رویہ اپناتے ہوئے 'بحرِ عشق' کو اُردو کی ابتدائی نثر جان کر ان غلطیوں کو نظر انداز کر دینے کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔

قصہ فیروز شاہ: محمد بخش فورٹ ولیم کالج کے لیے ''قصہ فیروز شاہ' (۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۷ھ) ضبط تحریر میں لائے۔ یہ قصہ بھی دوسری مروجہ داستانوں سے مماثلت رکھتا ہے، اس میں شہزادہ فیروز شاہ باپ کے مرض کی خاطر گل دیو کندہ کی تلاش میں مہمات سر کرتا ہے۔ قصہ پن کے حوالے سے داستان میں نیا پن موجود نہیں ہے جبکہ زبان کے حوالے سے ڈاکٹر شہناز انجم یوں رقم طراز ہیں کہ ''اس کی زبان میر امن کی زبان سے واقعتاً لگا تو نہیں کھاتی مگر 'نثر بے نظیر' کی طرح بے کیف بھی نہیں۔'' (۲۱) جبکہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم 'قصہ فیروز شاہ' کے حوالے سے تمام فنی وادبی پہلوؤں پر بحث کرتی ہیں۔ وہ داستان کے پلاٹ کو مربوط اور اسلوب کو مناسب خیال کرتی ہیں، ان کے نزدیک مصنف مختصر جملوں کی مدد سے بول چال کی زبان استعمال کرتے ہوئے اپنے اسلوب کو پیچیدگی سے دور رکھتا ہے جبکہ قصہ بھی دلچسپ، مربوط اور رواں ہے۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم 'قصہ فیروز شاہ' کے حوالے سے یہ تاثر رقم کرتی ہیں ''اگرچہ محمد بخش کی زبان حیدر بخش حیدریؔ، میر امنؔ یا میر شیر علی افسوسؔ کے مقابلے کی نہیں پھر بھی بہت بہتر ہے۔'' (۲۲)

گلزارِ دانش: سید حیدر بخش حیدریؔ نے 'گلزارِ دانش' (۱۸۰۴ء/ ۱۲۱۸ھ) کے نام سے عنائت اللہ کی فارسی تصنیف 'بہارِ دانش' کا ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۷۶ء میں اسے مرتب کرکے لاہور سے دو جلدوں میں شائع کروایا، مقدمے میں مرتب نے حیدریؔ کی تمام تصانیف 'قصہ مہر و ماہ'، 'لیلیٰ مجنوں'، 'توتا کہانی'، 'آرائشِ محفل'، 'گلزارِ دانش' اور 'مختصر کہانیاں' کا سرسری جائزہ لیا۔ 'گلزارِ دانش' کو اشاعت نصیب نہ ہوسکی اس لیے یہ دُنیا کی نظروں سے اوجھل رہی۔ مقدمے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی حیدریؔ کے طریق طرز کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''ایک بڑے ہی دلکش اور دلآویز اسلوب کی طرح ڈالی۔ اس اعتبار سے وہ اُردو نثر کے ایک اہم صاحب طرز انشاء پرداز اور ایک منفرد تخلیقی فن کار نظر آتے ہیں۔'' (۲۳) جبکہ ان کے ان خیالات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ڈاکٹر عبیدہ بیگم ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' میں حیدریؔ کی اس داستان کے اسلوب کو پر تصنع اور اشعار کی کثرت کی وجہ سے قصہ کی روانی کو متاثر پا کر حیرت زدہ ہیں کہ توتا کہانی کے مصنف کے زورِ قلم سے یہ امید نہ تھی۔

سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے تنقیدی خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے اِس خیال کے داعی ہیں کہ حیدریؔ نے انیسویں صدی میں اپنی تمام تصانیف میں جو اسلوب برتا وہی زمانے کا عام اسلوب بنا نیز حیدریؔ نے یہ بھی باور کروایا کہ سادہ، سلیس اور سنجیدہ اُردو میں ہر طرح کے خیالات ادا ہو سکتے ہیں خواہ وہ نثر قصہ گوئی کے لیے ہو یا تاریخ و سیرت کے لیے، اُن کا طرز بیان تمام اصناف ادب کے لیے موزوں تھا۔ سید وقار عظیم حیدریؔ کو اُردو زبان کا مزاج شناس کہتے ہوئے یہ موقف و منشا اختیار کرتے ہیں ''اگر حیدری کی وہ سب تصانیف یا تالیفات جو اس وقت پردہ خفا میں ہیں شائع ہو جاتیں تو یقیناً حیدریؔ کا مرتبہ اُردو نثر میں اس سے بڑا ہوتا جیسا کہ اب ہے۔'' (۲۴) اِس میں ہرگز دورائے نہیں کہ 'گلزارِ دانش' اگر چھپتی تو حیدریؔ کی دوسری معروف داستانوں 'توتا کہانی' اور 'آرائشِ محفل' کی مانند اُردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔

حیدریؔ کی تین داستانوں 'آرائشِ محفل'، 'توتا کہانی' اور 'گلزارِ دانش' کا آپس میں موازنہ ڈاکٹر شہناز انجم نے بہت خوبصورت اور مدلّل انداز میں کیا ہے۔ ان کے خیال میں 'آرائشِ محفل' میں حاتم کا کردار مثالیت اور تصنع کا مرکب لگتا ہے، 'توتا کہانی' میں قصہ حکایت نما کہانیوں کے سہارے آگے بڑھتا ہے جبکہ 'گلزارِ دانش' اگر چھپتی تو ان دونوں سے مقبولیت کے گراف میں اوپر ہوتی۔ ڈاکٹر شہناز انجم 'گلزارِ دانش' کو سراہتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> 'گلزارِ دانش' میں ایک مربوط و مسلسل عشقیہ داستان بیان کی گئی۔ قصے میں مثالیت کی جگہ واقعیت ہے اور یہی سبب ہے کہ زبان زندگی سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ ارضیت اور

واقعاتی سچائیاں اُس نثر کوحرارت اور تازگی کے ساتھ تاثر اور کیف عطا کرتی ہیں۔ یہاں برائیاں اور بھلائیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور احساسات کے گداز نیز مشاہداتی وسعت کے ذریعے اس نثر میں حُسن اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔''(۲۵)

اِس داستان پر متضاد تنقیدی خیالات دیکھنے کو ملتے ہیں، ایک طرف ڈاکٹر عبیدہ بیگم داستان کے اسلوب کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہیں تو دوسری طرف ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر شہناز انجم ان کے تنقیدی خیالات کی نفی کرتے ہیں۔ بعد ازاں حیدریؔ نے نظامیؔ کی فارسی مثنوی 'ہفت پیکر' کا منظوم ترجمہ 'ہفت پیکر' کے نام سے ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ میں کیا۔ حیدریؔ کی 'ہفت پیکر' کی بعض کہانیاں نصیحت آموز مختصر داستانوں کی مانند ہیں۔

بہارِ عشق (ترجمہ نل دمن): فیضی کی مشہور مثنوی 'نل دمن' کو سید نور علی نے 'بہارِ عشق' (۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ) کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس قصے کا اصل ماخذ 'مہا بھارت' ہے جس کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین قصوں میں ہوتا ہے۔ 'بہارِ عشق' راجہ نل اور شہزادی دمن کی عشقیہ داستان ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کو داستان کی فضا پر ہندوستانی تہذیب و ماحول کا عکس نظر آیا۔ با اعتبار زورِ بیان ان کو 'بہارِ عشق' کی زبان بے کیف، بے مزہ، غیر سلیس اور تصنع و آورد سے لبریز لگی۔ انھی تنقیدی خیالات کو تقویت دیتے ہوئے جاوید نہال لکھتے ہیں کہ مصنف کی خام اور ناہموار زبان نے ''سلاست کا خون کیا ہے اور یہ اسلوب کی آب و تاب پر سیاہ داغ کی مانند نظر آتی ہے۔''(۲۶) جب کہ ڈاکٹر شہناز انجم، جاوید نہال کے بیان سے قدرے اختلاف کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں اُردو نثر کے ابتدائی دور میں جب اُردو زبان چلنا سیکھ رہی تھی تو اس عہد کے تناظر میں یہ زبان اتنی بھی غیر معیاری نہیں کہ اسے سیاہ داغ کے نام سے پکارا جائے۔ ان کے مطابق مصنف نے شعوری طور پر قافیہ پیمائی کی جس کی بدولت فصاحت و سلاست میں توازن خراب ہوگیا۔

ہفت گلشن: ناصر علی خاں بلگرامی کی فارسی تصنیف 'ہفت گلشن' کا اُردو ترجمہ مظہر علی خاں ولاؔ نے ۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ میں کیا اور انھوں نے اِس کا نام 'ہفت گلشن' ہی رہنے دیا۔ کتاب میں سات ابواب ہیں اور ہر ایک کا نام گلشن ہے۔ یہ کتاب اخلاقی اور پند و نصیحت پر مبنی حکایات کا مجموعہ ہے۔ اس کے کردار انسانوں کے علاوہ جانور اور پرندے بھی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے داستان کی ''زبان کو صاف اور سادہ''(۲۷) کہا اور انھی خیالات کی داعی ڈاکٹر عبیدہ بیگم بھی ہیں۔ اس داستان کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کیا اور اُردو دُنیا کراچی سے شایع کروایا۔ مقدمے کے آخر میں وہ داستان کی زبان کو صاف، سلیس، رواں، شگفتہ اور شاداب قرار دیتے ہیں جبکہ پند و نصائح کے موضوعات پر مبنی ان کہانیوں کی تعبیر اپنے الفاظ میں وہ یوں کرتے ہیں:

''اس کتاب کے موضوعات ایسے ہیں کہ ان سے انسان آج بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے......
آج بھی ان میں تازگی کا احساس ہے۔ 'تحفت گلشن' اگرچہ مختصر سی کتاب ہے لیکن موضوع اور
انداز بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔'' (۲۸)

قصہ دل آرام و دلربا: ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے 'قصہ دل آرام و دلربا' (۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۸ھ) کو تو تارام کی طبع زاد تصنیف بتایا ہے، جس میں قصہ دلچسپ ہے مگر موضوع کے حوالے سے نیا پن نہیں ہے، ضمنی کہانیوں کی موجودگی میں پلاٹ مربوط ہے نیز پلاٹ پر ہندوستانی فضا کا غلبہ ہے۔ داستان میں سادگی کے عنصر کے ساتھ روانی میں خلل بھی موجود ہے۔ جاوید نہال نے اسے لالہ کاشی راج کھتری کی تالیف بتایا ہے۔ ان کے مطابق ''قصہ دل آرام و دلربا'' ہندوستانی چینی کہانی ہونے کی بنا پر مقبول نہ ہو سکی۔ فورٹ ولیم کالج میں داستان کو رسائی کی سیڑھی سمجھ کر جو بھی گلکرسٹ کے پاس آتا اس کے گذر اوقات کا سلسلہ چل نکلتا تھا۔ جاوید نہال کے خیال میں لالہ کاشی راج کھتری کا شمار بھی انھی لوگوں میں ہوتا ہے۔ داستان کے اسلوب میں خامیوں اور کمزوریوں کی طرف وہ یوں اشارہ کرتے ہیں:

''قصہ دل آرام و دلربا کی عبارت گنجلک، اسلوب بے جان اور طرز بھونڈی ہے۔ اکثر پنجابی
لفظ جیسے کبھی کے بجائے کدھی وغیرہ استعمال ہوئے جس کی وجہ سے سلاست اور روانی جاتی
رہی ہے۔'' (۲۹)

جبکہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم جاوید نہال کی تمام تر تحقیقی تفصیلات جو قصے کے مصنف اور وجہ تصنیف کے متعلق ہیں دلائل سے غلط ثابت کرتی ہیں۔

بہارِ دانش: اسی دور میں مرزا جان طپش نے ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ میں 'بہارِ دانش' کا منظوم ترجمہ لکھا۔ اس میں شاعر نے شہزادہ جہاں دارا اور بہروز بانو کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے طپش کے منظوم قصے 'بہارِ دانش' کو مرتب کر کے مجلس ادب ترقی لاہور سے شائع کروایا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے طپش کے اس قصے کا ماخذ عنایت اللہ کنبوہ کا فارسی نسخہ بتایا۔ سید محمد نے 'ارباب نثر اُردو' میں اس مثنوی کی بحر پر 'سحر البیان' کے تتبع کی نشاندہی کی نیز واقعہ نگاری کے حوالے سے 'سحر البیان' اور 'بہارِ دانش' کا موازنہ کر کے ارشاد کرتے ہیں جو مقبولیت میر حسنؔ کی مثنوی کو حاصل ہے اس کا راز اسی میں پنہاں ہے مگر ''طپش نے بھی کوشش کی ہے کہ جذبات کی محاکات و کیفیات و مناظر کو بہتر پیرایہ میں پیش کریں۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ وقائع نگاری کے لحاظ سے ان کے بیانات نہایت عمدہ ہیں۔'' (۳۰) خلیل الرحمٰن اعظمی بھی طپش کے قلم کا یہ اعجاز بتاتے ہیں کہ ''مثنوی طبع زاد معلوم ہوتی ہے اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک لاجواب طبع زاد قصے میں ہو سکتی ہیں۔'' (۳۱)

اسی طرح کے تنقیدی خیالات کے داعی ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی ہیں۔ انھیں بھی ''مثنوی سے طپش کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔'' (۳۲) لیکن افسوس کہ 'سحر البیان' کے تتبع میں لکھی گئی دوسری منظوم داستانوں کی مانند یہ داستان بھی قعرِ گمنامی میں گم ہوگئی نیز اس داستان کے ماخذ 'سحر البیان' کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کے سامنے کسی اور داستان کا چراغ جل نہ سکا۔

درج بالا غیر معروف داستانوں کے علاوہ نور خاں نے 'قصہ بلند اختر' (۱۸۰۴ء/ ۱۲۱۹ھ) تصنیف کیا۔ انھوں نے یہ قصہ مثنوی کی صورت لکھا مگر کالج میں کسی طرح کی پذیرائی نہ ہونے پر انھوں نے یہی منظوم قصہ، نثر میں منتقل کیا۔ شاکر علی نے 'الف لیلیٰ' کے نام سے داستان لکھی۔ درج بالا غیر معروف داستانی ادب کے مصنفین میں باسط خاں باسطؔ (گل وصنوبر)، تو تا رام (قصہ دل آرام و دلربا)، غلام حیدر (گل و ہرمز)، شاکر علی (الف لیلیٰ) اور محمد بخش (قصہ فیروز شاہ) فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ اور باضابطہ ملازمین نہ تھے۔ (۳۳)

فورٹ ولیم کالج کے غیر معروف داستانی ادب پر اچٹتی سی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معروف داستانوں کی طرح غیر معروف داستانی ادب بھی مختلف دوسری زبانوں کی داستانوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ طرزِ بیان سادگی کی طرف رواں ہے، سادہ اسلوب کالج کے تمام مصنفین کے ہاں قدرِ مشترک ہے۔ ارادتاً ایک انداز اور وضع اختیار کرنے کے باوجود تمام مصنفین کا اسلوب اپنے اپنے ماحول، مزاج اور شخصیت سے راست تناسب ہو کر منفرد شناخت رکھتا ہے۔ ان تمام غیر معروف داستانوں میں اخلاقیات اور اعلیٰ کردار کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے، یہ لوگ فلسفی نہیں تھے لیکن داستانوں میں حکایتوں اور نصیحتوں کی صورت میں فلسفیانہ رنگ و آہنگ نمایاں کرنے میں اُردو ادب میں زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔ اِن داستانوں کے تجزیے سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ یہ داستانی ادب مختلف تہذیبوں کا بہترین امتزاج اور مرکب ہے مثلاً 'گلزارِ چین'، 'حسن و عشق' اور 'ہفت گلشن' چونکہ فارسی کے توسط سے آئی ہیں لٰہذا اِن پر فارسیت کا رنگ غالب ہے اور ان میں اسلامی شان و شوکت موجود ہے جبکہ دوسری طرف 'بہارِ عشق' اور 'قصہ دل آرام و دلربا' میں ہندی تہذیب جلوہ گر ہے۔ یہ تمام غیر معروف داستانیں محض کلاسیک کا درجہ نہیں رکھتی ہیں بلکہ اِن میں مدفون ہندالمانی اور فارسی تہذیبوں کا سراغ بھی موجود ہے جن کے تسلسل میں ہم ادب اور سماج کو عہد بہ عہد سفر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان تمام غیر معروف داستانوں کو وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہو سکی جس کی یہ مستحق تھیں، اس کے پیچھے بہت سے محرکات اور وجوہات ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ اوّلاً فورٹ ولیم کا بانی اور روحِ رواں لارڈ ویلزلی تھا جسے گلکرسٹ جیسا صاحبِ ذوق ملا۔ جب تک یہ دونوں حضرات موجود رہے کالج میں تصنیف و تالیف کا عہد عروج پر رہا بعد ازاں داستانی ادب کو وہ پذیرائی نہ مل سکی۔

ثانیاً فورٹ ولیم کالج میں باضابطہ اور باقاعدہ دیگر زبانوں سے داستانی ادب ترجمہ کیا گیا، نئی تخلیق وتصنیف مشکل اور دقت طلب کام تھا لہٰذا موجودہ کتب کو اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق ڈھالنا آسان تھا۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تن آسانی اور سہل کوشی کے باعث فورٹ ولیم کالج کے داستانی ادب کو پروان چڑھایا گیا، مترجمین اور مصنفین میں شعوری یا لاشعوری طور پر تقلیدی رجحان بھی غالب نظر آتا ہے۔ انھوں نے نئے رجحانات اور حالات کی کسک کے مطابق نیا ادب اختراع کرنے کی بجائے تتبع کرنے کو مقدم جانا، تاریخ گواہ ہے کہ جب تخلیق تقلید کے لیے جگہ خالی کردے تو ادب زوال آمادہ ہوتا ہے علاوہ ازیں میر امّن، حیدر بخش حیدرؔی اور نہال چند لاہوری جیسے مقلدین بھی نہ پیدا ہو سکے۔

ثالثاً اُردو کے اِس غیر معروف داستانی ادب کا نقادوں سے بے وقعتی کا گلہ بجا ہے مگر بدقسمتی سے ان میں سے بعض داستانوں کو اشاعت بھی نہ نصیب ہو سکی۔ مثلاً ''گلزارِ دانش'' از حیدر بخش حیدرؔی، 'گلزارِ چین' از خلیل علی خاں اشکؔ، 'ہفت گلشن' از مظہر علی خاں ولاؔ اور 'چار گلشن' از بنی نرائن جہاںؔ شایع نہیں ہو سکی تھیں لہٰذا یہ داستانیں غیر معروف ہو کر زمانے کی گرد میں گم ہو گئیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر شہناز انجم نے اِن داستانوں میں تحقیقی حوالوں سے مختلف تاریخی ادوار اور ان کی تہذیب وثقافت میں غواصی کرنے کی سعی کی ہے جبکہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے تحقیق کے ساتھ ساتھ کثیر الجہتی تنقید بھی کی ہے، وہ تکنیک، پلاٹ، قصہ گوئی، کردار نگاری اور طلسم وعیاری جیسے تمام پہلوؤں کو اپنے تنقیدی دائرہ کار میں لائی ہیں اور داستانوں میں بہکے ہوئے قلموں کی لغزشوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے عقلیت پرستی کے اِس دور میں ان غیر معروف داستانوں کی تعبیر وتشریح اور تفہیم وتقویم کر کے مختلف فنی وادبی جہات کو روشن کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو، اشاعت سوم، ۲۰۱۴ء، ص ۲۵۰

(۲) اشکؔ، محمد خلیل علی خاں، گلزار چین، مرتب: عبادت بریلوی، سن، ۱۹۶۶ء، ص ۲۲

(۳) عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، الہ آباد: فائن آفسٹ ورکس، اشاعت اوّل، ۱۹۸۳ء، ص ۳۱۵

(۴) ایضاً، ص ۳۱۴

(۵) اشکؔ، محمد خلیل علی خاں، گلزار چین، مرتب: عبادت بریلوی، ص ۲۲

(۶) شہناز کوثر، اُردو داستانوں کے منفی کردار (آغاز تا ۱۸۱۰ء)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱۳

(۷) عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،ص۳۱۴

(۸) سلیم سہیل،اُردو داستان میں تخیل اور تحیّر،لاہور: آر آر پرنٹرز، ۲۰۱۷ء،ص۱۲۴

(۹) جہاںؔ، بنی نرائن(مولف)،چار گلشن،مرتب:عبادت بریلوی،کراچی: اُردو دُنیا، ۱۹۶۷ء،ص۵۵

(۱۰) عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،ص۳۳۹

(۱۱) ایضاً،ص۳۳۸

(۱۲) شہناز انجم،ادبی نثر کا ارتقاء۔ شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک،نئی دہلی: ثمر آفیسٹ پریس،اشاعت اوّل،۱۹۸۸ء،ص۱۸۶

(۱۳) جاوید نہال،انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب،کلکتہ: اُردو رائٹرس گلڈ،س۔ن،ص۲۹۳

(۱۴) عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،ص۳۸۹

(۱۵) شہناز انجم،ادبی نثر کا ارتقاء۔ شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک،ص۱۷۳

(۱۶) عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،ص۴۰۱

(۱۷) گیان چند،اُردو کی نثری داستانیں،ص۳۴

(۱۸) ایم حبیب خان،اُردو کی قدیم داستانیں،علی گڑھ: جھلک پریس،طبع اوّل،۱۹۷۴ء،ص۱۰۲

(۱۹) عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،ص۳۷۶

(۲۰) شہناز انجم،ادبی نثر کا ارتقاء۔ شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک،ص۱۷۹

(۲۱) ایضاً،ص۱۸۹

(۲۲) عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،ص۳۶۷

(۲۳) حیدریؔ،حیدر بخش، گلزار دانش ،مرتب:عبادت بریلوی،لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،دفتر اوّل،۱۹۷۶ء، ص۴۶

(۲۴) وقار عظیم،سید،فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ ،ترتیب وتعارف:سید معین الرحمٰن،لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء،ص۶۸

(۲۵) شہناز انجم،ادبی نثر کا ارتقاء۔ شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک،ص۱۷۶

(۲۶) جاوید نہال،انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب،ص۳۹۵

(۲۷) گیان چند،اُردو کی نثری داستانیں،ص۳۳۲

(۲۸) ولاؔ،مظہر علی خاں(مولف)،ہفت گلشن،مرتب:عبادت بریلوی،کراچی:اُردودُنیا،۱۹۶۴ء،ص۱۷

(۲۹) جاوید نہال،انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب،ص۴۰۱

(۳۰) سید محمد،ارباب نثر اُردو،نئی دہلی:اعتقاد پبلشنگ ہاؤس،طبع اوّل،۱۹۷۷ء،ص۲۲۰

(۳۱) طپشؔ،مرزاجان،بہار دانش،مرتب:خلیل الرحمٰن اعظمی،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۳ء،ص۳۲

(۳۲) فرمان فتح پوری،اُردو کی منظوم داستانیں،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء،ص۴۳۸

(۳۳) محمد عتیق صدیقی،گلکرسٹ اور اُس کا عہد،نئی دہلی:انجمن ترقی اُردو ہند،اشاعت دوم،۱۹۷۹ء،ص۱۷۸